ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

تجھ سا کہیں جسے

دیوبند کے محلّہ اندرون کوٹلہ کے صدیقی خاندان کو دیوبند کے دیگر شیوخ خاندان میں امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔اس خاندان کی نزاکت طبع، نفاست ظاہری، حسن آرائی، جمال آفرینی اور دوسری اس قسم کی جتنی بھی جلوہ آرائیاں ممکن ہوسکتی تھیں اللہ نے سب ان کو ودیعت کی تھیں۔اس کا پس منظر جہاں ایک طرف زمین دارانہ نظام تھا وہیں ان کا علمی تفوق بھی انھیں سب سے بالاتر کیے ہوئے تھا۔عیدگاہ اور اس کے اطراف کی زمینیں انھیں حضرات کی وقف کردہ تھیں اس لیے پوزیشن یہ ہوتی تھی کہ جب تک کوٹلہ کے یہ شیوخ عیدگاہ میں نہیں آجاتے تھے تب تک عید کی نماز کا تصوّر نہیں تھا۔صف اوّل پر کسی دوسرے قبیلے کے آدمی کو بیٹھنے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب چیزیں رخصت ہوگئیں۔لیکن ان واقعات کے چشم دید مشاہدین آج بھی موجود ہیں۔سینہ بہ سینہ سنی ہوئی یہ روایات آج بھی مجھ جیسے بہت سے حضرات کے ذہنوں میں من وعن محفوظ ہیں۔اب تو نہ وہ کوٹلہ رہا اور نہ ہی وہ شیوخ، نہ وہ کروفر رہے اور نہ ہی وہ پیچ تاب۔لیکن خاندانی برتری کا احساس دل ودماغ سے کھرچا نہیں جاسکتا۔

اس خاندانی برتری وتفوق کے مندرجہ بالا تصوّر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب میں پروفیسر عتیق احمد صدیقی مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں میں جھانکتا تو مجھے کہیں بھی عتیق صاحب مرحوم میں کوٹلہ کی وہ ''خو''، و''بو'' نظر نہ آتی۔بسا اوقات اس کا اظہار خیال میں ان کے منہ پر بھی کر دیتا اور وہ ہنس کر خاموش ہوجاتے۔لیکن ان کے اچانک چلے جانے کے بعد مجھے اس کا احساس ہوا کہ ان میں یہ خو وبو تھی لیکن اسے انھوں نے دنیا کے لیے نہیں آخرت کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔اللہ تعالیٰ نے انھیں جس طریقے پر جمعہ کے دن عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مغرب کی تیاری کرتے ہوئے باوضو اپنے دربار میں بلایا وہ نہ صرف

اللہ کی نظر میں ان کی مقبولیت کو ثابت کرتا ہے بلکہ وہ ہم جیسے گنہ گاروں کے لیے قابل رشک بھی ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہمیں بھی اپنی رضا سے نوازے آمین!

کوٹلہ کے شیوخ کی مندرجہ بالا خصائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ہم پروفیسر عتیق احمد صدیقی مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے خاندان کی اس خصوصیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری تھی۔ جب کہ اسی خاندان کے دیگر افراد میں خاتمۂ زمین داری کے باعث پریشان کن حالات اور تقسیم ہند کے بعد پیدا شدہ نامساعد لمحات کے باوجود ان کے مزاجوں میں رچی بسی وہ عادات مرتے دم تک نہیں گئیں۔ راقم خود ان نازک مزاجیوں کا عینی شاہد رہا ہے۔ بہرحال کوٹلہ کے شیوخ کی یہ کیفیات اور عتیق صاحب مرحوم کا انکسار دو متضاد کیفیات تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عتیق صاحب مرحوم نے دونوں کو ہی خوب نبھایا۔

دراصل عتیق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دردمند دل اور روشن دماغ دونوں نعمتیں وافر مقدار میں عطا کی تھیں۔ انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس میں انھیں مزاج تو یہی دیکھنے کو ملا لیکن حقائق اس مزاج کے بالکل برعکس تھے اس لیے انھوں نے حقائق سے سمجھوتہ کیا۔ حقیقت یہی تھی کہ زمین دارانہ نظام ختم ہونے سے پہلے ہی ان کے پیر زمین پر آ چکے تھے اور وہ اس زمینی حقیقت کو بخوبی محسوس کر رہے تھے کہ اگر اب بھی حالات اور وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تو وہ دن دور نہیں جب ''ہماری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔'' جب ان کی پیدائش (۱۰ر ستمبر ۱۹۳۳ء) ہوئی تو ان کے والد بابو رفیق صاحب مرحوم بہ سلسلۂ ملازمت کیرانہ میں سترہ روپیہ ماہانہ کے ملازم تھے۔ کچھ سالوں بعد ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو اپنے مستقر دیوبند واپس ہوئے۔ جہاں انھیں اپنی اہلیہ چھ بیٹیوں اور دو بیٹوں کی کفالت کی فکر دامن گیر تھی۔ بیٹوں نے حالات کو بہ خوبی محسوس کیا۔ بڑے صاحب زادے ڈاک خانہ کی سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ چھوٹے بیٹے نے اپنی پڑھائی اور محنت کا عمل جاری رکھا۔ کسی نہ کسی طرح حفظ قرآن کے بعد ہائی اسکول

پاس کرلیا تو فکر معاش نے دیوبند کو خیرباد کہلوادیا۔ دہلی میں جاکر اس بچہ نے دن میں ایک اسکول میں معمولی ملازمت کی اور رہائش کا ذریعہ بنانے کی خاطر ایک مسجد کی امامت کرکے اپنے خاندانی مقام، منصب اور مزاج سے فروتر سمجھی جانے والی ملازمت اختیار کی اور رات کو سڑک کے کنارے جلنے والی لالٹین کی روشنی میں پڑھ کر علم کی قندیل کو روشن کیے رکھا، اور دونوں سفر بیک وقت جاری رکھتے ہوئے تعلیم کا معیار بلند کیا، تعلیمی معیار کی بلندی کے سبب تھوڑا ملازمت کا گریڈ بھی بڑھا اور تھوڑا شوق علم بھی۔ اسی لیے بہت جلد ترقی کرتے کرتے حافظ عتیق احمد، بابو عتیق احمد ہوگئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ خدا نخواستہ انھوں نے حفظ قرآن سے اپنے راستے منقطع کر لیے تھے۔ انھوں نے اسے نعمت خداوندی سمجھتے ہوئے اس سے اپنے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کیا اور اللہ سے لو، اس سے زیادہ لگائی جتنی پہلے تھی۔ ''لئن شکرتم لأزیدنکم'' (اگر تم شکر کروگے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا) کے مصداق اللہ تعالیٰ نے عتیق صاحب کو مزید نعمتوں سے نوازا۔ وہ ڈگری ہولڈر ہونے کے ساتھ اسی اسکول میں ٹیچر ہوگئے جس کی کیاریوں کو انھوں نے نیارا تھا۔ لیکن عتیق صاحب کا منزل مقصود یہ بھی نہ تھا انھیں تو ابھی کچھ اور کچھ اور کرنے کی دُھن تھی۔ اسی دُھن نے ان سے ایم اے کرایا۔ ان کی خداداد صلاحیتوں، ذہانت اور انتھک محنت کے جذبے نے علم نوازوں کو ان کی طرف متوجہ کیا تو وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے آگئے۔ اس انتھک مسافر کی تحقیق وجستجو کا سفر پھر بھی جاری رہا جس نے عتیق احمد صدیقی کے ساتھ ''ڈاکٹر'' سابقہ لگاکر انھیں ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی بنادیا۔ عتیق صاحب ۱۹۶۶ء میں علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ آنے کے بعد انھوں نے کسی بھی دن پیچھے کی طرف مُڑکر نہیں دیکھا۔ اس عزم اور جہد مسلسل نے انھیں ریڈر، اور پروفیسر شپ عطا کی۔ یہ ان کی تعلیمی ترقی تھی زمانہ صرف ان کی عملی صلاحیتوں کا ہی معترف نہیں رہا بلکہ ایس ایس ہال (ساؤتھ اور نارتھ مشترکہ) کی پرووسٹ شپ، اردو شعبہ کی صدارت، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ڈائرکٹر سرسید اکادمی، سکریٹری تعلیمی امور، یوپی رابطہ کمیٹی، فکر ونظر کی ادارت، جامعہ اردو کی نیابت شیخ الجامعہ، مسلم ڈگری کالج مرادآباد کے

بانی پرنسپل، علی گڑھ زکوٰۃ فنڈ کی نائب صدارت اور نہ جانے کن کن عہدوں پر زمانے نے ان کی انتظامی صلاحیتوں کو پرکھا اور انھیں ہر جگہ ایک قابل منتظم، مختی رضا کارانہ جذبہ رکھنے والے رفیق کی حیثیت سے پایا۔

پروفیسر عتیق صاحب مرحوم کے سراپا، ان کی خوش خلقیوں اور عادات واطوار پر نظر ڈالتا ہوں اور یہ بھی دیکھتا ہوں کہ خوش مزاجی کی باتیں کرتے کرتے بالکل اچانک زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر گئے اور پھر انھیں کس طرح "منہا خلقنا کم و فیها نعید کم و منها نخرجکم تارۃ اخریٰ" (اس مٹی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے ہم تم کو دوسری مرتبہ نکالیں گے) کہتے ہوئے منوں مٹی تلے دبا دیا گیا۔ تو شاعر کا یہ شعر ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

انتقال سے ایک دن قبل (۱۶ دسمبر کی صبح) میں عتیق صاحب سے ملنے گیا۔ بالکل خوش بلکہ اور دنوں سے بھی کچھ زیادہ ہی خوش۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ گھریلو بھی سماجی بھی، عوامی بھی، فلاحی بھی۔ گزشتہ ہفتہ علی گڑھ زکوٰۃ فنڈ نے تقریباً چار سو کمبل تقسیم کیے تھے۔ وہ علی گڑھ زکوٰۃ فنڈ کے نائب صدر تھے اور میں خازن۔ اس تقسیم کمبل پروگرام میں مستحقین کی طرف سے جو مناظر دیکھنے کو ملے تھے (جو عمومی طور پر ایسے فلاحی عوامی پروگراموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں) ان پر سیر حاصل تبصرے اور اس کام کو مزید مسلسل جاری رکھنے کا عزم، یو پی رابطہ کمیٹی کے بہت سے پروگراموں پر کھلی بات چیت، لطیفے لطائف، غرض سبھی کچھ ہوا۔ بہت سی نصیحتیں بھی کیں۔ ان کے نصائح کا پندار ذہن میں لیے ہوئے گھر آیا۔ رات کو معلوم ہوا کہ عتیق صاحب کے پیٹ میں درد کی شکایت ہو رہی ہے۔

(۱۷ دسمبر) صبح اہلیہ کے ساتھ پھر عتیق صاحب کی عیادت کے لیے گیا۔ اس میں بھی عیادت کم ہوئی خوش گپیاں زیادہ۔ عتیق صاحب کبھی بیمار بھی ہوتے ہیں یہ تو واہمہ

میں بھی نہیں تھا۔ اسی دن معلوم ہوا تھوڑی سی کراہنے کی آواز بھی سنی۔ ''خریداران یوسف'' میں اپنا نام شامل کرنے کی غرض سے میں نے ان سے الٹرا ساؤنڈ کرانے کی عرض معروض کی، اور ہم واپس آ گئے۔ جمعہ کی نماز کے بعد حسّان (عتیق صاحب کے چھوٹے صاحب زادے) سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ اب الٹرا ساؤنڈ کرانا ہے۔

عصر کی نماز کے بعد الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے بارے میں پوچھنے کے لیے عتیق صاحب کے پاس گیا۔ بتانے لگے رپورٹ ٹھیک ہے۔ دس بارہ الٹیاں ہوئیں، کچھ کمزوری ہوگئی ہے۔ میں نے از راہ مذاق کہا کہ حضور نازک مزاجی چھوڑیے۔ ڈٹ کر کھایئے پیجئے۔ ہم جیسوں کی طرح بے حس ہو جایئے۔ دیکھیے خود بہ خود چاق و چوبند ہو جائیں گے۔ میرے تبصرے پر ہنسنے لگے۔ اور شاید یہ ان کی آخری ہنسی تھی۔ کیوں کہ میں نے بااصرار انھیں پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ کہنے بھی لگے کہ مغرب کے بعد لیٹوں گا۔ میں نے کہا نہیں آپ آرام کر لیجیے۔ ابھی مغرب میں دیر ہے وہ لیٹے اور میں گھر آ گیا۔ میرا گھر عتیق صاحب مرحوم کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ابھی آ کر میں بیگم کو یہ تفصیلات بتا ہی رہا تھا کہ عتیق صاحب کا پوتا گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ''عاصم چاچا، عاصم چاچا ذرا جلدی چلیے۔ ابا حضور کی طبعیت خراب ہو رہی ہے۔'' میں نے سوچا شاید پھر الٹی ہوئی ہوگی۔ بغیر گھبراہٹ کا شکار ہوئے گھر پر پہنچا مغرب کی اذان کا وقت بالکل قریب تھا۔ میں نے دیکھا تو عتیق صاحب مرحوم کی روح قفس عنصری سے پرواز ہو چکی تھی۔ فوزان بھائی (عتیق صاحب کے بڑے صاحب زادے) اور اسماء (عتیق صاحب کے چھوٹے صاحب زادے کی دلہن) ہی گھر پر تھے۔ عتیق صاحب کی بڑی دلہن اور چھوٹی بیٹی باہر بچوں کو ٹہلا رہی تھیں۔ یہ کیا ہوا؟ دل و دماغ کی سوچنے، سمجھنے کی تمام طاقتیں سلب ہو گئیں۔ حواس یکجا ہوئے تو فوزان صاحب سے معلوم ہوا کہ میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی عتیق صاحب کہنے لگے کہ مغرب کا وقت ہو رہا ہے وضو کر لی جائے، وضو کرنے کے لیے چوکی بچھائی۔ لوٹے میں پانی لیا وضو کرنے لگے۔ دایاں پیر دھو چکے اور پھر ہاتھ بائیں

پیر پر جا کر رُک گیا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد فوزان نے ان کا بایاں پیر دھونا چاہا تو وہ ان کی گود میں آ گئے۔ انھوں نے فوراً بچے کو میرے پاس دوڑایا اور انھیں پلنگ پر لٹایا لیکن ان کی روح ''یا ایّھا النفس المطمئنة، ارجعی الیٰ ربك راضية، فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی ۔'' (اے باطمینان نفس تو اپنے رب کی طرف خوشی خوشی لوٹ پس تو میرے عبادت گزاروں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا) کا مصداق بن کر رخصت ہو گئی۔ سب سے پہلے میں ہی گھر میں داخل ہوا تو دیکھا عتیق صاحب اب ہمارے درمیان صرف جسمانی طور پر ہیں۔ اس درمیان ان کی روح ہزار ہا بلکہ لاکھوں میل کا تصوراتی سفر پلک جھپکتے میں طے کر چکی تھی۔ ادھر ہر چہار سو مؤذنین کی ''اللہ اکبر اللہ اکبر'' مغرب کی اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی نمازی اس مسجد کی طرف کشاں کشاں چلے آ رہے تھے جس کے بالکل سامنے عتیق صاحب کا گھر ہے اور جہاں پر انھوں نے اس کی تعمیر کے پہلے دن سے لے کر کچھ ماہ پہلے تک امامت کے فرائض انجام دیے تھے جس نے اس خبر کو سنا اسے یقین ہی نہیں آیا۔ لیکن بالآخر یقین کرنا ہی پڑا واقعی بات ہے۔ ''کل من علیها فان، و یبقیٰ وجه ربك ذو الجلال'' (ہر وہ شخص جو دنیا میں آیا ہے اس کو فنا ہونا ہے اور باقی رہنے والی تیرے رب کی ذات ہے جو مرتبہ اور عزت والی ہے۔)

عتیق صاحب مرحوم سے میرا تعلق مختلف الجہاتی تھا وہ میرے عزیز ترین بھی تھے اور میرے مشفق و مربی بھی۔ یو پی رابطہ کمیٹی کی بنیاد قائم ہونے سے قبل ہی میرے اور ان کے تعلق کی بنیادیں مستحکم اور مضبوط تھیں۔ رابطہ کمیٹی سے متعلق ہو جانے کے بعد ہم دونوں کے فکری سوتے ایک دوسرے سے ملے تو اس میں مزید پختگی آئی۔ کبھی ایک دن کے لیے بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے اور میرے درمیان فکر میں یا تعلق میں کوئی اختلاف رونما ہوا، بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی مسئلہ میں رابطہ کمیٹی کی میٹنگ میں ان سے اختلاف رونما ہوا لیکن رابطہ کمیٹی کے کبھی اراکین نے کبھی ان اختلافات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا چنانچہ وہ مسئلہ وہیں ختم ہو گیا۔ اور جس کی رائے اکثریتی رائے ہو گئی سبھی نے اس پر عمل کیا۔

راقم السطور نے عتیق صاحب مرحوم کو سفر و حضر، خانگی و سماجی زندگی میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا خلوص، پیار، محبت، ہمدردی، غم گساری، خوشی و غم کے لمحات کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے صبر، ضبط، ہمت و استقلال، عہد و پیمان، جرأت و ہمت، حسن سلوک، شفقت و تربیت کے انداز بھی دیکھے ہیں۔ نقد و جرح، بے باک تبصروں، بے لاگ تجزیوں، خوش مزاج کیفیات اور غصہ سے بے بس جذباتی لمحات بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں یہ بات پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی کسی بھی معاملے میں ان کی بدنیتی محسوس نہیں کی۔ ان کا ہر معاملہ حسن نیت پر منحصر ہوتا۔ وہ کبھی کسی کے عہدے، اقتدار یا منصب سے مرعوب نہیں ہوتے۔ انھوں نے جو باتیں خلوص نیت کے ساتھ ملت کے مفاد سے وابستہ دیکھیں اس کے اظہار میں وہ کبھی نہیں ہچکچائے۔ ان کی بات سنی اَن سنی ہوگئی۔ یہ تو بسا اوقات ہوا، لیکن حق سے یا حقیقت سے منہ موڑنا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔

عتیق صاحب مرحوم میں خاص بات یہ تھی کہ وہ کسی بھی کام کی ذمہ داری اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک کہ وہ خود اسے انجام دینے کے اہل نہ ہوں، پروگرام چھوٹا ہو یا بڑا، کام تنظیمی نوعیت کا ہو یا سماجی نوعیت کا، اسے انجام دینے کے لیے ان کی اوّلین شرط یہی تھی کہ وہ اسے تنہا کہاں تک کر سکتے ہیں؟ معاونین پر پورا بھروسہ ہونے کے باوجود اس کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوتے تھے کہ کام معاونین کریں اور نام ان کا ہو جائے۔ کاموں کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک ان کی نگاہ ہوتی تھی، کئی پروگراموں میں ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ میں نے کسی کام کے لیے مرحوم سے کہہ دیا کہ یہ کام فلاں صاحب کر لیں گے، تو عتیق صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کام مرحوم نے خود ہی کر لیا، بسا اوقات ان معاملات میں اپنی تساہلی و کاہلی پر خفت بھی اٹھانی پڑتی تھی، اور ان کی برق رفتاری و دور بینی پر رشک بھی آتا تھا۔

۹، ۱۰، ۱۱ اپریل ۲۰۰۴ء کے لیے مرحوم نے مرادآباد، ٹانڈہ اور رام پور وغیرہ کے مختلف اسکولوں و مدارس کے تعلیمی پروگراموں میں شرکت کی غرض سے پروگرام ترتیب

دیا۔ پروفیسر محمد شریف خان مرحوم (نائب صدر یوپی رابطہ کمیٹی) اور راقم کو بھی ساتھ لیا۔ یہ سفر حادثاتی سفر تھا۔ ٹانڈہ میں ۹ر تاریخ کی رات کا پروگرام تھا۔ ۱۰ر کی صبح وہاں سے رخصت ہوئے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی (نائب مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد و نائب صدر یوپی رابطہ کمیٹی ضلع مرادآباد) کو بھی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا۔ رام پور سن وے اسکول میں پروگرام ہوا۔ ظہر کی نماز کے بعد ہم گاڑی سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ مرادآباد سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر پہلے ہی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ تینوں بزرگ حضرات مجروح ہوگئے۔ راقم نے کسی نہ کسی طرح ہمتیں یکجا کیں، اور ان حضرات کو مرادآباد تک لایا، مرادآباد ہسپتال میں پروفیسر محمد شریف خان صاحب مرحوم داغ مفارقت دے گئے۔ عتیق صاحب کی پسلیوں میں فریکچر ہوگیا۔ مولانا کی دونوں ٹانگیں مجروح ہوگئیں۔ جب ہوش آیا تو عتیق صاحب نے مجھ سے شریف صاحب اور مولانا کے متعلق دریافت کیا، میں نے شریف صاحب مرحوم کے انتقال کی اطلاع کو چھپالیا، بار بار مجھ سے یہی اصرار کرتے رہے کہ شریف صاحب اور مولانا کا خیال رکھنا۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ رات میں، میں شریف صاحب مرحوم کی میت علی گڑھ لے آیا اور عتیق صاحب کے صاحب زادگان انھیں اگلے دن علی گڑھ میڈیکل کالج میں لے آئے۔ یہاں آکر بھی شریف صاحب مرحوم کی خیریت دریافت کرتے رہے، ہم لوگ گول مول جواب دے کر ٹال جاتے۔ تقریباً بیس پچیس دن بعد مجھے باقاعدہ گھر سے بلوایا اور کہنے لگے کہ ''حامد صاحب کا تیمارداری کا خط آیا ہے انھوں نے شریف صاحب کو مرحوم لکھا ہے۔'' میں نے شروع میں تھوڑی تاویلات کیں لیکن جب انھیں اطمینان نہیں ہوا تو میں نے انھیں یہ دل دوز خبر سنادی۔ انھیں اس خبر سے جو صدمہ پہنچا ہوگا اس کا اظہار میرے سامنے اس وقت تو نہیں کر سکے، البتہ ۸ر اگست ۲۰۰۴ء کو سید حامد صاحب کی صدارت میں رابطہ کمیٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں شریف صاحب مرحوم کے لیے تعزیتی قرارداد منظور ہونی تھی اس وقت ہم سب نے عتیق صاحب مرحوم کو ضبط کے بندھن توڑتے دیکھا۔ آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے اور وہ اس ایکسیڈنٹ اور شریف صاحب مرحوم کی

ناگہانی موت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے رہے تھے۔ جوان کی روحانی تکلیف کا اظہار کر رہا تھا۔ حالاں کہ عتیق صاحب مرحوم خود بھی زیادہ بیٹھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے لیکن تقریباً دو گھنٹہ تک اس میٹنگ میں بیٹھے رہے پھر میں ہی انھیں گھر پر چھوڑ کر آیا۔

۱۰ر اپریل ۲۰۰۴ء کے حادثے نے عتیق صاحب مرحوم کو جسمانی و روحانی تکلیف پہنچائی تھی۔ جسمانی طور پر وہ اس حادثے سے جاں بر تو ہو گئے لیکن روحانی طور پر وہ اپنے کو اس سے آزاد نہیں کر سکے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس حادثے کی شدت نے ہی ان کی دیوار دل کو ڈھیر کر دیا ہو جس کی وجہ سے تقریباً آٹھ ماہ بعد یعنی ۱۷ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو وہ دنیا سے جسمانی طور پر بھی رخصت ہو گئے۔

اس حادثے کے کچھ دنوں بعد عتیق صاحب مرحوم نے ایک دن مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ ''اب میں رابطہ میں کام کرنے کے قابل تو نہیں رہا اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ سکریٹری شپ سے استعفیٰ دے دوں، تمھاری کیا رائے ہے'' میں نے مرحوم کے اس فیصلے پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی اور ان سے کہا کہ '' آپ سکریٹری رہیے خدمت کے لیے ہم جیسے آپ کی خدمت میں تیار ہیں۔ آپ استعفیٰ مت دیجیے'' کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ عتیق صاحب مرحوم نے اپنا استعفیٰ صدر رابطہ کمیٹی سید حامد صاحب کو بھیج دیا۔ سید صاحب نے بھی یہ جواب دے کر استعفیٰ واپس کر دیا کہ ''اگر آپ سکریٹری شپ اس وجہ سے چھوڑ رہے ہیں کہ آپ کام کے اہل نہیں تو مجھے بھی صدارت سے سبک دوش ہو جانا چاہیے کیوں کہ میں بھی تو کوئی کام نہیں کرتا۔''

عتیق صاحب مرحوم نے مجھے دونوں کی مراسلت کا مضمون بتایا اور پھر میری رائے لی۔ میں نے مرحوم کے اس فیصلہ پر بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت احتجاج کا مظاہرہ کیا اور پہلی بات دُہرائی۔ اس کے جواب میں عتیق صاحب مرحوم نے جو کچھ کہا اس نے میری آنکھیں کھول دیں فرمانے لگے کہ ''عاصم صاحب! یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کام آپ کریں اور نام عتیق احمد کا ہو اب چوں کہ میں کام کرنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے آپ مجھے استعفیٰ دینے دیجیے'' اب میرے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔

عتیق صاحب مرحوم نے چوں کہ زندگی کے تلخ وتند سفر کو اپنے بازوؤں کی ہمت، فطری صلاحیت، شبانہ روز محنت اور اولوالعزمی کے سہارے طے کیا تھا اس لیے وہ سفارش، خوشامد، چاپلوسی و تملق سے بہت زیادہ متنفر تھے۔ ان ''خارجی اوصاف'' کو نہ تو انھوں نے اپنی ترقی کا زینہ بنا کر استعمال کیا اور نہ ہی کسی دوسرے کے لیے پسند کیا۔ مرحوم کی ان باتوں سے ان کے عزیز ترین بھی ناراض ہو جاتے تھے لیکن وہ کسی کی ناراضگی کے ان معاملات میں کبھی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد کے لیے بھی کبھی کسی کے پاس سفارش کے لیے نہیں گئے۔ وہ یونیورسٹی میں جن ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز رہے اگر چاہتے تو ان کا فائدہ اٹھا کر اپنے بچوں کو اعلیٰ ترین ڈگریاں یا یونیورسٹی کی ملازمتیں دلوا سکتے تھے لیکن انھوں نے اسے ایک دن بھی پسند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا روزینہ ان کے پانچ بچوں و بچیوں میں سے کسی کے بھی حصے میں نہیں آیا۔ الحمدللہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر عتیق صاحب مرحوم کی اولاد زندگی کے مختلف میدانوں میں والد مرحوم کے نقش حیات پر چل کر اپنا سفر معاش جاری رکھے ہوئے ہے۔

عتیق صاحب مرحوم کے یہاں علم سے متعلق چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بے انتہا اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ کسی ادارہ میں خلفشار دیکھتے تو جز بز ہو کر رہ جاتے تھے۔ ان کی کوششوں سے بہت سے اداروں کے مسائل حل ہوئے۔ بہت سے پرائمری اسکولوں کو جونیر ہائی اسکول، جونیر ہائی اسکولوں کو ہائی اسکول، ہائی اسکولوں کا انٹر کالج، اور انٹر کالجز کو ڈگری کالج بنانے کے ارتقائی سفر میں ان کے مفید مشوروں و خاموش عملی کوششوں کا بہت زیادہ دخل رہا۔ مسلم اداروں میں پیدا شدہ تنازعات کا حل ان کی اوّلین کوشش ہوتی تھی۔ اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے، چنانچہ مرادآباد کا مسلم ڈگری کالج جس کے وہ بانی پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ اسے جب انھوں نے نزاعات میں گھرا ہوا محسوس کیا تو انتظامیہ کے بے حد اصرار کے باوجود وہ خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر گئے اس معاملہ میں ان کی زندگی اس شعر کا مصداق رہی۔

کوئی بزم ہو، کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں ایک چراغ جلا دیا

تعلیمی مہم میں مصروف، بچوں کی حوصلہ افزائی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، چنانچہ جب بھی کوئی بچہ قابل قدر کام انجام دیتا اس کو اپنی جیب خاص سے انعام دیتے۔ میری بچی نے گجرات کے فسادات (۲۰۰۲ء) سے متاثر ہوکر انگریزی میں ایک نظم THE SEARCH OF HUMINITY لکھی اس وقت وہ آٹھویں کلاس کی طالبہ تھی۔ عتیق صاحب نے نظم دیکھی تو بے حد متاثر ہوئے، بچی کو گلے لگالیا۔ بہت حوصلہ افزائی کے کلمات کہے گھر پر تشریف لائے اور بچی کو خوب ساری ٹافیاں انعام میں دیں۔ ایسا وہ تب بھی کرتے جب بچوں کا رزلٹ آتا اور بچے انھیں دکھاتے، اس بچی نے ہائی اسکول کا امتحان اسی فیصد سے زائد نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ تو خوب دعائیں دیں۔ حالاں کہ وہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلیف محسوس کررہے تھے، گھر پر آنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اس حالت میں بچی کو انھوں نے گھر پر بلایا اور حسب دستور انعام دیا۔

عزیزوں کے دکھ درد اور خوشی غمی میں شرکت کو اپنا فریضہ تصور کرتے تھے۔ علی گڑھ سے دیوبند کا سفر انتہائی پریشان کن اور تھکا دینے والا رہا ہے۔ لیکن وہ اس میں بالکل بھی تکلف محسوس نہیں کرتے، کوئی بھی موقع ہوتا تو حتی الامکان شریک ہوتے۔ کئی دفعہ انھیں بہت سی زحمتوں کا بھی سامنا ہوا لیکن اسے انھوں نے کبھی عذر نہیں بنایا۔

عتیق صاحب مرحوم کا ایک اور وصف یہ تھا کہ وہ سفر وحضر میں کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ ان کے ساتھ بے انتہا اسفار کا اتفاق ہوا۔ رابطہ کے پروگراموں میں اکثر وبیش تر ساتھ ہی رہتے۔ یوپی تعلیمی کارواں (۱۹۹۲ء) ملک گیر سطح کے کارواں (آل انڈیا تعلیمی کارواں (۱۹۹۵ء) صحت کارواں (۱۹۹۸ء) اصلاح معاشرہ کارواں (۱۹۹۴ء) فرقہ وارانہ ہم آہنگی کارواں (۲۰۰۳ء) کے پروگرام تو کئی کئی دنوں پر مشتمل رہے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عتیق صاحب کا سامان کسی دوسرے کو اُٹھانا پڑا ہو۔ وہ سفر میں مختصر سامان لے کر چلنے کے عادی تھے ان کے سامان میں ضرورت کی سبھی چیزیں

فراہم ہوتی تھیں جو وہ دوسرے ساتھیوں کو بھی پیش کرتے تھے۔ وہ اپنی ضروریات کا یہاں تک خیال کرتے کہ استنجا کے لیے چاک اور دانت کریدنے کے لیے خلال بھی ان کے سامان میں موجود ہوتی تھی۔ سفر میں کبھی کسی کو بور نہ ہونے دیتے تھے۔ عام طور پر ان کی گفتگو فکر انگیز ہوتی تھی لیکن جب وہ محسوس کرتے کہ فکری گفتگو سامعین کو بوجھل کر رہی ہے تو وہ لطائف سے زعفران زار کر دیتے تھے۔ اس طریقہ پر کوئی بھی ساتھی بوریت محسوس نہیں کرتا۔

شروع میں ان کے ساتھ سفر کرنے میں مجھے قدرے تکلف محسوس ہوتا تھا کیوں کہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بزرگ بلکہ بزرگ تر قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ قرابت داری بھی تھی جس کی وجہ سے لحاظ پاس رہتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے مجھے بے تکلف بنا دیا۔ بلکہ اگر اسے گستاخ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ اسی بنا پر میں بسا اوقات ان کے سامنے ایسی باتیں کر جاتا جو ان کے شایان شان نہیں تھیں۔ بعد میں ان پر غور کرتا تو خجالت بھی محسوس ہوتی لیکن ان کی وسعت ظرفی کہ وہ ہنس کر ٹال جاتے اور پھر کبھی ان کا اعادہ بھی نہ کرتے۔

اس مختصر سی تحریر میں عتیق صاحب کے اوصاف کا احاطہ کر پانا ناممکن ہے۔ مختصراً یوں ہی کہا جا سکتا ہے کہ عتیق صاحب مرحوم نے اپنی شرافت، دیانت، عظمت، خودداری جیسے تمام اوصاف کے ساتھ متبرک دن کے پُر سعید لمحات میں باوضو ہو کر اپنی جان کا نذرانہ مالک حقیقی کے حضور پیش کر کے ہم جیسے عامی مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا کہ ان کے یہ اوصاف بارگاہ خداوندی میں بھی مقبول تھے۔ ان کی اس قابلِ رشک حیات و موت پر یہ شعر صد فی صد صادق آتا ہے۔

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

عتیق صاحب مرحوم کی زندگی قابلِ عمل ہے تو سانحۂ وفات قابلِ رشک۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا نظام کسی ایک شخص کے چلے جانے سے فنا نہیں ہو جاتا لیکن کسی

ایسے متحرک، فعال اور بااثر شخصیت کے چلے جانے سے زندگی میں ٹھہراؤ لازمی آتا ہے۔ عتیق صاحب مرحوم کے انتقال سے تحریکی کاموں میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہوگا یا نہیں یہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن مستقبل قریب میں اس کے امکانات زیادہ نظر نہیں آتے۔ کیوں کہ وہ صرف یوپی رابطہ کمیٹی کا ہی ایک قابلِ فخر سرمایہ نہیں تھے بلکہ وہ اپنے علمی وقار، متوازن طبیعت، دینی فکر وبصیرت اور ملّی اتحاد واتفاق کی وجہ سے تمام حلقوں میں مقبول ومتعارف تھے۔ اسی وجہ سے ان کی وفات کا اثر ملّت کے تمام طبقات میں یکساں طور پر محسوس کیا گیا۔ جو اس شعر کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔

کارواں سے کیسے کیسے لوگ رخصت ہوگئے
کچھ فرشتے چل رہے تھے جیسے انسانوں کے ساتھ

●